

۱۹۸۵ء

۷

مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

(۳)

سعید احمد اکبر آبادی

دور جدید کے اردو شعراء میں حسرت موہانی مفتی صاحب کو سب سے زیادہ پسند تھے، وہ ان کے بڑے مداح اور معترف تھے، ان کی غزلوں کی غزلیں مفتی صاحب کو یاد تھیں، حسرت کی ایک غزل جس کے دو شعر یہ ہیں:

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغاز و فنا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں!
بے زبانی — ترجمانِ شوقِ بیحد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں!
ایک اور غزل ہے جس کے یہ دو شعرا ب تک مجھے یاد ہیں:

دامنوں کی نہ خبر ہے نہ گریبانوں کی
قابل دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی
اے جفا کار ترے عہد سے پہلے تو نہ تھی
کثرت اس درجہ محبت کے پشیمانوں کی

مفتی صاحب کو حسرت کی یہ دو غزلیں بہت پسند تھیں، بہانہ بہانہ سے

۳۲۷

برہان دہلی

انھوں نے اس کو اتنی بار پٹھا کہ سنتے سنتے مجھے بھی یاد ہو گئی تھیں، ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کیا: تمہیں حسرت کا کونسا شعر سب سے زیادہ پسند ہے؟ میں نے کہا یہ شعر:

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی
مزدہ دے گئی حسن کی بے شعوری

بولے: اوہو ہو! کیا غضب کی داخلیت ہے۔

حسرت سے مفتی صاحب کی ملاقات بھی عجب ڈرامائی انداز میں ہوئی، ایک مرتبہ مفتی صاحب نے بیان کیا: تحریک خلافت شباب پر تھی، اس کی ایک کانفرنس کروچی میں تھی، اس میں شرکت کے لیے دارالعلوم دیوبند سے میں اور چند ساتھی کو اچی کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں صبح کے وقت ہم بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ہمارے سروں پر اوپر کی برتھ پر ایک صاحب تشریف فرما ہیں جو فریہ اندام اور پست قامت ہیں، رنگ سانولا، چہرہ پر چھپک کے نشان، ڈاڑھی گنجان، آنکھیں درختاں اور بڑی، پیشانی فراخ اور کشادہ، نہایت موٹے کھدر کی شیروانی اور پاجامہ، سر پر میلی کچلی ترکی ٹوپی، عمر چالیس پچاس کے درمیان، اب ہم لوگوں کی ان بزرگوں پر اچانک نظر پڑی تو ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی، سوال یہ تھا کہ یہ ہیں کون بزرگوار؟ جتنے منہ اتنی باتیں، کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ، میں نے کہا: یہ بزرگوار کوئی بھی ہوں مگر ہیں کوئی بڑے آدمی ضرور! اتنے میں ایک بڑا اسٹیشن آگیا اور ہم نے ایک مکلف ناشتہ کا آرڈر دیا، ناشتہ آگیا تو ہم نے ان صاحب سے کہا: آئیے جناب ناشتہ کر لیجئے، وہ فوراً پھدک کر نیچے تشریف لے آئے اور میرے پہلو میں بیٹھ گئے، اب گنگو شروع ہوئی:

ہم : جناب کہاں جا رہے ہیں ؟
 وہ : (خضاتی آواز میں) جی ! میں کراچی جا رہا ہوں۔
 اب ہمارے کان کھڑے ہوئے اور ہم نے پوچھا : کیا آپ بتا سکتے ہیں کیوں ؟
 وہ : وہاں خلافت کانفرنس میں شریک ہونا ہے۔

ہم : جناب کا اسم گرامی !
 وہ : فضل الحسن میرا نام ہے۔
 میں : (اشتقاق دید کی اضطرابی کیفیت کے ساتھ) ارے تو آپ مولانا سید
 فضل الحسن حسرت موہانی ہیں !

وہ : اب آپ نے پہچان ہی لیا تو میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔
 یہ سن کر ہم سب کو جڑی خوشی ہوئی اور ہم میں سے ہر ایک نے بڑی عقیدت کے ساتھ
 مولانا سے مصافحہ کیا، اب مولانا نے کہا : آپ بھی تو اپنا تعارف کرائیں، جب مولانا
 کو علم ہوا کہ ہم سب دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں اور مدرسہ کی جمعیت الطلاب
 کے مجدد دار ہیں تو مولانا بڑے مسرور ہوئے اور ہم سے فروداً فروداً دوبارہ مصافحہ
 کیا، اب ناشتہ سے فراغت کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھے تو میں نے مولانا سے عرض
 کیا : حضرت ! ہم سب آپ کے کلام کے عاشق ہیں، کچھ عطا فرمائیے، مولانا نے
 فوراً اسنانا شروع کر دیا۔ پہلے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ
 ہے :

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
 سننے نہ کوئی، مرے دل میں یا دہن میں رہے

اس کے بعد دو تین غزلیں اور سنائیں، مفتی صاحب کہتے تھے : علاوہ شعروشاعری
 کے مولانا کی گفتگو بڑی دلچسپ اور پر لطف ہوتی تھی۔

مجھے بڑے بھائیوں کے محلہ میں رہتے ہوئے دو برس ہی ہوئے تھے کہ رمضان کی تعطیل میں آگھر آیا تو یہاں حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم دارالعلوم جن کی شفقت توجہ اب میری طرف زیادہ ہو گئی تھی ان کا ایک والد نامہ والد صاحب قبلہ کے نام لکھا ہوا جس میں تحریر تھا: ”سعید دیوبند کے محلہ بڑے بھائیوں میں رہتا ہے وہاں اس کے صحبتِ قصبہ کے لڑکوں کے ساتھ رہتی ہے، میں اس کو پسند نہیں کرتا اس لئے اب آپ سعید کو مدرسہ کے احاطہ میں رکھیں“ والد صاحب نے جواب دیا: ”آپ نے بکاؤڑا میں تعمیل ارشاد کروں گا، مگر درخواست یہ ہے کہ آپ سعید کو ایک کمرہ بلا شرکتِ غیرا دے دیں اور نیز آپ اس کو براہِ راست اپنی یا کسی بڑے استاد کی نگرانی میں رکھ دیں مہتمم صاحب نے دونوں باتیں مان لیں، چنانچہ مدرسہ یا مسجد کی طرف سے دارالافتاء میں جانے کے لیے جو زمینہ اوپر جا رہا ہے اس کے وسط میں بائیں جانب اس زمانہ میں صرف دو کمرے تھے (اب تیسرا بھی بن گیا ہے) ان میں سے ایک کمرہ جو دروازہ کے سیدھے میں ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد شیدی رہتے تھے اور دوسرا کمرہ جس کی بغل میں ہے اس کو مولانا حبیب الرحمن صاحب نے میرے لیے تجویز فرمایا۔ اس بنا پر رمضان کی تعطیل کے ختم پر میں مدرسہ آیا تو اسی کمرہ میں فروکش ہوا اور رہنے لگا۔

اب میرے قیام دارالعلوم کا تیسرا دور شروع ہوا جو آخری بھی ہے، یہ دور جو تین برس کی مدت پر متمد ہے، میری تعلیمی زندگی کا نہایت اہم دور ہے، کیونکہ میری تعمیر و تشکیل جو کچھ ہوئی ہے اسی دور میں ہوئی ہے، پہلے میرا ماحول شرعی و ادبی تھا، لیکن اب میرا ماحول علمی اور دینی تھا، پہلے میری صحبت چند شہری طلبہ کے ساتھ تھی، اب میں ہر وقت اساتذہ کرام اور چند نہایت ہونہار اور ذہین و مستفید مختلف صوبوں کے طلبہ کی معیت میں تھا۔ میرا کھانا پینا اور ناشتہ وغیرہ حضرت الاستاذ مولانا

سراج احمد رشیدی کے ساتھ تھا، مولانا جو حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت بھی تھے، دارالعلوم کے اکابر اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، اردو اور فارسی کے پختہ کلام شاعر بھی تھے، طبعاً نہایت شگفتہ مزاج، بذلہ سیخ اور مجلسی بزرگ تھے، ہر جمعرات کو ان کے ہاں مغرب کے بعد احباب کی مجلس جہتی تھی جو اپنے اپنے گھر سے کھانا لاکر ایک ساتھ ہم طعمائی کرتے تھے اور کھانے کے بعد سبز چائے کا دور چلتا تھا جس کا..... اہتمام مولانا بہت زیادہ کرتے تھے، اس مجلس کے ارکان خاص علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، شیخ الادب مولانا محمد اعجاز علیؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا محمد بدر عالم صاحب میرٹھی۔ مفتی صاحب طباطبائی بھی بہت اچھے تھے اور خصوصاً مرغ کا اسٹوپکانے میں تو ان کو بڑا کمال تھا۔ اسی لئے اس مجلس میں کبھی کبھی اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی چیز بھی لے کر آتے۔ اسی طرح مولانا محمد بدر عالم صاحب بڑے اچھے شکاری تھے، اس لئے وہ کبھی مرغابی یا تیتیر سے اس مجلس کی تواضع کرتے۔

مفتی صاحب اس زمانے میں مدرس تھے اور دارالافتاء میں فتویٰ نویسی بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں کرتے تھے، مفتی صاحب نے جو کچھ پڑھا تھا بڑے شوق و دل کی لگن اور محنت سے پڑھا تھا، پھر ذکاوت و فطانت خداداد اور فطری اور اساتذہ کرام اپنے اپنے فن میں لیگانہ روزگار، اس بنا پر ہر علم و فن کی استعداد مفتی صاحب کی پختہ اور اعلیٰ تھی، اس پر مستزاد یہ کہ ان میں ملکہ تقریر و خطا اعلیٰ قسم کا تھا، افہام و تفہیم کی صلاحیت قدرتی تھی، اپنے مافی الضمیر کا اظہار بڑی وضاحت اور صفائی سے کرتے جس میں گجھلک یا الجھن نام کو بھی نہ ہوتی تھی، اس بنا پر ان کا درس مقبول تھا، البتہ آواز ان کی بلند تھی اور دیریں بھی وہ اس بلند آواز سے دیتے تھے کہ ان کی آواز درس گاہ سے باہر دور تک جاتی تھی، مفتی صاحب

کو طوطی اپنی بلند آوازی پر ہنس آتی تھی، ایک دن چختے چختے سنا نے لگے: ایک
 مرتبہ جامع ازہر مصر کے ایک استاد یہاں آئے ہوئے اور دانا علوم کے چھوٹے
 میں مقیم تھے، ایک روز وہ درس گاہوں میں گھومتے پھرتے میری درس گاہ میں بھی
 آگئے، میں اس وقت مسلم العلوم (منطق) کا درس دے رہا تھا، میں نے مصری عالم کو
 خوش آمدید کہہ کر اپنے پاس بٹھالیا اور درس شروع کر دیا اور جب گفتہ بجا اور درس
 ختم ہو گیا تو موصوف مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے: ”یا استاذ واللہ! انکے لوجن
 فاضل، ولکنک تجہو جمہیر البری احناف انکے ستکون حمانا۔“ منطق کا
 یہ واقعہ سنا کر خود بھی ہنس پڑے اور ہم سب کو بھی ہنس آ گئی۔

جہاں تک مفتی صاحب کی فتویٰ نویسی کا تعلق ہے اس کے متعلق وہ خود بیان
 کرتے تھے کہ شروع شروع میں وہ استفتا کا جواب بہت طویل لکھتے تھے جس میں
 موافق اور مخالف دلائل اور اخیر میں قول راجح کے دلائل اور ان کی عبارتوں کی
 بھرمار ہوتی تھی، لیکن حضرت مفتی صاحب ایسے تمام جوابات قلم زد کرتے تھے اور
 فرماتے تھے کہ تمہارا جواب ماقول و دل ہونا چاہئے، ہر عبارت نقل کے لائق نہیں ہوتی،
 پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ مستفتی تم سے بحث نہیں کر رہا ہے، بلکہ ایک مسئلہ کے
 بارے میں صرف ایک حکم شرعی دریافت کر رہا ہے اس لئے تمہارا مطالعہ تو وسیع اور
 عمیق ہونا ضروری ہے لیکن جواب مختصر ہونا چاہئے جس میں صرف چھنی چھنائی بات
 کا ذکر ہو، مفتی صاحب کہتے تھے: بڑی مشق اور تمرین کے بعد جب مجھ میں یہ صلاحیت
 اور استعداد پیدا ہو گئی تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: ”ہاں اب تم کو فتویٰ
 لکھنا آگیا۔“

نیشنلزم یعنی قوم پروری اور استقلال وطن کی تڑپ جیسے مفتی صاحب کی گھٹی
 میں پڑی تھی، اس معاملہ میں جتنا سنجیدہ فکر اور پختہ خیال میں نے مفتی صاحب

دیا پایا ان کے معاصرین میں کسی کو نہیں پایا، ان کی طالب علمی کے زمانہ میں طلبہ کا ایک نئی اخبار نکلتا تھا جس کا نام یاد نہیں رہا، اس اخبار کی ایک اشاعت میں مفتی صاحب کا ایک طویل مضمون سودیشی کی ضرورت“ شائع ہوا تھا، میں نے یہ مضمون ارد اول ناظر پڑھا، مضمون نہایت مدلل اور بصیرت افروز، پر زور اور سنگفتہ و دلکش زبان میں تھا، میرے دماغ پر مفتی صاحب کے حسن تحریر کا پہلا نقش ان کے اسی مضمون کے مطالعہ سے قائم ہوا تھا، انھوں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا تھا اس کے علمی پیکر وہ خود تھے، چنانچہ اس زمانہ میں بھی جبکہ دارالعلوم کے ”شہزادے“ یعنی اکابر دیوبند کی اولاد، نہایت عمدہ ملل، پکین کے کروتوں اور چالیس ہزارہ کے لٹھے کے پاجاموں میں ملبوس نظر آتے تھے۔ مفتی صاحب اس زمانے میں بھی کھدر پہنتے تھے، وضع کے اتنے پابند تھے کہ ایک کوٹہ جو زیادہ لانا بنانہیں ہوتا تھا بغیر کالر کے ہوتا اور پاجامہ جوڑے پائنجوں کا اور سیدھی کاٹ کا اور دونوں کھدر کے اور کوٹہ کے نیچے بنیان وہ بھی کھدر کی عمر بھران کا لباس یہی رہا، شیردانی پہنتے تھے مگر وہ بھی دیسی کپڑے کی، اس قسم کے وضع دار خال خال ہی ملیں گے۔

مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی میرے ماموں زاد بھائی تھے اور مجھ سے بیحد محبت کرتے تھے، سیوہارہ کے مدرسہ میں تکمیل تعلیم کے بعد دورہ حدیث کے لیے دیوبند آئے تھے اور جس سال (۱۳۵۷ھ) میں خود دورہ حدیث کا طالب علم تھا اس سال یہ صحیح بخاری کا سماع کر رہے تھے، اس لئے انھوں مجھ سے کہا: تم ہمہ تن متوجہ ہو کر حضرت شاہ صاحب (علامہ محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ) کی تقریر سنو اور میں تمہارے لئے وہ تقریر لکھتا رہوں گا، چنانچہ انھوں نے دو موٹی موٹی کاپیاں لکھی تھیں، جنھیں میں حرز جاں بنائے رکھتا تھا، لیکن جب ۱۳۷۷ھ میں میرا گھر لٹا تو یہ کاپیاں بھی گئیں، کر دیا سفاک نے میدان صاف

مفتی صاحب کی طرح مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی بھی مشرور سے ہی جذبہ استقلال وطن و قوم پروری سے سرشار تھے اور ملکی و قومی مسائل و معاملات میں دونوں کے افکار و نظریات میں بڑی ہم آہنگی و یک جہتی تھی اس پر مستزاد یہ کہ مولانا بڑے فعال و متحرک تھے، ان میں لیڈر بننے کے صفات بدرجہ اتم موجود تھے، ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے، اس وجہ سے اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے بھی مفتی صاحب اور مولانا میں دانت کاٹنے کی دوستی تھی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (ثم مہاجر مکی) کو ملکی سیاست اور قومی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن وہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اس لیے مفتی صاحب سے خاص تعلق اور ربط رکھتے تھے، اس طرح ہم چار آدمیوں (مفتی صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمن، مولانا بدر عالم اور راقم الحروف) کا ایک گروپ بن گیا تھا جو اوقات مدرسہ کے بعد عموماً ایک ساتھ رہتا تھا۔

ہم چاروں عصر کی نماز اکثر حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ان کی مسجد میں ادا کرتے تھے، اس مسجد میں دو کمرے تھے، ایک اندرون مسجد اور دوسرا بیرون مسجد، پہلا کمرہ حضرت مفتی صاحب کے لئے مخصوص تھا اور دوسرا مفتی صاحب کی نشست گاہ تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد اگر ٹہلنے یا کہیں جانے کا پروگرام نہ ہوتا تو مغرب تک اسی کمرہ میں نشست رہتی، مسجد میں امامت عموماً تو حضرت مفتی صاحب ہی کرتے تھے، لیکن جہری نماز میں کبھی کبھی وہ مفتی صاحب کو آگے بڑھا دیتے تھے، مفتی صاحب حافظ اور ساتھ ہی قاری تو اول درجہ کے تھے ہی ان کی آوازیں لوچ اور ہلکا ہلکا سادہ دہی غصب کا تھا اس لیے نماز میں بڑا لطف آتا تھا، ایک واقعہ

ہی ہے :

۳۷ء میں ایم اے کا امتحان دلی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس

کرتے کے بعد مفتی صاحب کی دعوت پر جب میں پہلی بار کلکتہ گیا تو ایک روز مفتی صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمن اور میں، ہم تینوں عصر کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لئے بالی گنج میں ان کی کوٹھی پر گئے۔ مولانا صاحب معمول بڑے تپاک اور بے تکلفی سے ملے، باتیں کرتے کرتے مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تو مولانا کے ملازم احمد نے وہیں ڈرائنگ روم میں جانا زین بچھا دیں، مولانا اور ہم با وضو تھے ہی، سیدھے گھٹیلے پر جا کھڑے ہوئے، اب ہم نے مولانا سے امامت کی درخواست کی، لیکن مولانا نہ مانے اور مفتی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا۔ مفتی صاحب نے سورۃ القارئہ اور سورۃ الکہم النکاح اپنے لحن داؤری میں تلاوت کیں، سلام پھیرنے کے بعد مولانا آزاد نے دو رکعتیں سنت کی ادا کیں مگر کمال خشوع و خضوع سے، اس کے بعد صوفیہ پر بیٹھ گئے، آنکھیں بند کر لیں، ایک اوئی چادر جو اوڑھے تھے اس سے اپنے تمام جسم اور آنکھوں کو مستغنی کر کے تمام سر اور چہرہ چھپا لیا۔ دس منٹ کے بعد جب آنکھیں کھولیں تو مفتی صاحب کو خطاب کر کے فرمایا: ”مولوی صاحب! اگر اصول تجوید کی رعایت کے ساتھ حسن صوت نہ ہو تو مخارج صحیح ادا ہوں گے مگر دل پراثر نہ ہو گا، اللہ جل شانہ کا آپ پر بڑا فضل و کرم ہے کہ تجوید کے ساتھ خوش آوازی کی نعمت سے بھی آپ بہرہ ور ہیں۔ اس لیے آپ کی قرأت دل کے دروازہ پر دستک دیتی ہے۔“ ایک مرتبہ اس مسجد میں بڑا عجیب و غریب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ ہم چاروں نے حسب معمول عصر کی نماز مسجد میں حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ادا کی، ایک بنگالی طالب علم تھا وہ بھی کم از کم عصر کی نماز تو اسی مسجد میں پڑھنا تھا، آج اس نے یہ کیا کہ نماز کا سلام پھرتے ہی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: ”حضرات! اب میں دیوبند سے جا رہا ہوں، آپ میرے لیے دعا کریں کہ میرا خاتمہ بخیر اور اسلام پر ہو“ جب دعا ختم ہو گئی تو حضرت مفتی صاحب اس طالب علم کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: ”تم کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے

کہا: ”تھانہ بھون“ کیوں؟ حضرت مفتی صاحب نے دریافت فرمایا، ”حضرت تھانہ مظاہرِ العالی سے تصوف کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے“ طالب علم نے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت مفتی صاحب کو غصہ آگیا اور سخت لہجہ میں فرمایا: مولانا اشرف کو صوفی کون کہتا ہے، انھیں تصوف سے کیا واسطہ! حضرت مفتی صاحب کے یہ الفاظ بہ ظاہر بہت سخت اور حیرت انگیز ہیں، لیکن ان کی وضاحت واقعہ ذیل سے ہوگی:

اس واقعہ کے چھ سات برس کے بعد جب میں مدرسہ عالیہ مسجد فتحپوری دہلی میں تھا، ایک روز میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ باتوں باتوں میں حضرت تھانوی کا ذکر نکل آیا تو میں نے یہ واقعہ سنایا، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب اسے سنتے ہی ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے اور گونجھکا تھوڑی دیر کے بعد گردن اٹھائی، اور تاثراتی لہجہ میں فرمایا: ”میاں سعید! کیا یہ واقعہ سچا اور تمھارا عینی مشاہدہ ہے؟“ میں نے عرض کیا: ”جی ہاں! اس وقت مفتی عتیق الرحمن صاحب اور مولانا حفظ الرحمن صاحب بھی موجود تھے، یہ دونوں حضرات تو یہیں دلی میں موجود ہیں، آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔“ یہ سن کر فرمایا: اگر یہ واقعہ صحیح ہے — اور جب تم کہہ رہے ہو تو یقیناً صحیح ہی ہے — تو آج میرے دل کی ایک پرانی گرہ کھل گئی اور اس کی تفصیل یہ ہے: تحریک خلافت اور اس کے ضمن میں تحریک ترک موالات بڑے زوروں پر تھی اور جمعیت علمائے ہند کے زیر قیادت بڑی کامیابی سے چل رہی تھی، لیکن مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ تحریک میں نہ صرف یہ کہ شریک نہیں ہوئے، بلکہ اس کی مخالفت میں فتویٰ دیا۔

جمعیت علمائے ہند نے اس کا سخت نوٹس لیا اور طے کیا کہ جمعیت کا ایک سہ نفر وفد تھانہ بھون پہنچ کر براہ راست مولانا سے گفتگو کرے، اس وفد کے لیے

تین نام منظور ہوئے: (۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (۲) مولانا احمد سعید دہلوی (۳) میں (حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ) ہم تینوں تھانہ بھون پہنچے اور تین روز تک وہاں مقیم رہے، مولانا سے ہم لوگوں کی گفتگوؤں کا جو حشر ہوا وہ تو سب کو معلوم ہے، دراصل سننا یہ ہے کہ ایک دن ہم مولانا کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا، مولانا تھانوی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: حضرت! میں مظاہر العلوم کا ایک طالب علم ہوں، حضرت سے استفادہ باطنی کی غرض سے حاضر ہوا ہوں، مولانا نے پوچھا کیا تم نے پہلے سے خط کے ذریعہ اس کی اجازت لی ہے، یہ شخص بولا: جی نہیں، اس پر مولانا نے برسم ہو کر کہا کہ تم اٹھ جاؤ، مگر وہ نہیں اٹھا، مولانا نے پھر کہا جاؤ مگر وہ پھر بھی بیٹھا رہا، اس پر مولانا کے پاس ایک رتی کا بنا ہوا سونٹا رکھا رہتا تھا اس سے مولانا نے اس کو مارنا شروع کیا مگر یہ شخص اتنا ڈھیٹ تھا کہ پٹتا بہا مگر مجلس سے نہیں اٹھا، مولانا نے اس کو اتنا مارا کہ ہم سب کو رحم آگیا۔ اس وقت میرے دل نے کہا کہ مولانا تھانوی سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن صوفی نہیں ہو سکتے۔ اس واقعے کو سننے کے بعد مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میری دل کی آواز عجیب و غریب تھی اس لیے میں نے اس کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا اور اپنا احساس اپنے ہی تک محدود رکھا لیکن اب تم نے حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب کا واقعہ جو سنایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس احساس میں تنہا میں ہی نہیں ہوں بلکہ حضرت مفتی صاحب بھی اس میں شریک ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء کرام خلق خدا کے لیے سراپا رحم و کرم اور مجسمہ شفقت و محبت ہوتے تھے، ان کی خانقاہوں کا دروازہ ہر وقت ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا، ان کے یہاں آنے جانے والوں پر کسی قسم کی کوئی پکڑ دھکڑ یا دار و گیر کا

مضابطہ نہیں تھا، اس کے برخلاف حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں
مسترفدین کے لیے خاص خاص شرائط اور مضوابط تھے اور جو کوئی شخص ان
شرائط و مضوابط میں سے کسی مضابطے کی خلاف ورزی کرتا تھا وہ مورد خطاب نہ
تھا، اس فرق کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر مضابطہ
کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت تھانوی نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ میں دعوتی
ہوں نہ پیر بلکہ میں ایک معلم اور مصلح ہوں، جو شخص میرے پاس آتا ہے میں اس
کے لیے اصلاح و تربیت کا کام کرتا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بحیثیت معلم و مصلح اصلاح نفس، اصلاح عقائد،
اصلاح معاملات و رسوم اور اصلاح عبادات و اخلاق کے سلسلے میں جو نہایت
عظیم الشان علمی اور عملی کارنامے انجام دئے ہیں ان کے پیش نظر ان کو اس حد
کا مجتہد بے تکلف کہا جاسکتا ہے اس بنا پر حضرت مفتی عزیز الرحمن اور حضرت مفتی
کفایت اللہ صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کو صرف ایک لفظی اصطلاح کا فرق سمجھنا
چاہئے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں ان کے کردار اور معیار کے
مطابق نمبر جلد شائع ہونے جا رہا ہے۔ ایڈیٹر صاحب برہان کی طویل علالت
کی وجہ سے اس میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی ہے۔ آپ حضرت مفتی صاحب کے
سلسلے میں مضامین بلاتا خیر بھیجئے اور مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی
ایڈیٹر رسالہ برہان خٹے لئے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

مینجر رسالہ برہان
عید الرحمن عثمانی